خطبۂ صدارت

جو

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۶ء میں

بمقام دہلی

خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا، ایم ایل سی

نے پڑھا۔

کہ ملک کی عام اغراض بھی ملحوظ رہیں۔ ان ممتاز لیڈروں میں سے بعض اصحاب عالم بقا کو جا چکے ہیں۔ میری مراد نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم جیسے بزرگوں سے ہے لیکن اس وقت بھی ہمارے ہاں ہز ہائینس آغا خاں جیسی سر برآوردہ شخصیت موجود ہے جن کی دانشمندانہ رہنمائی سے لیگ کی ابتدائی ترقی میں بہت سی مدد مل چکی ہے۔ ہز ہائی نیس ان ممتاز اصحاب میں سے ہیں۔ جنہوں نے اس گفت و شنید میں حصہ لیا تھا۔ جس کا نتیجہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی وہ باہمی فہمید ہے۔ جسے ۱۹۱۶ کے "میثاق لکھنؤ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہز ہائی نیس موصوف کو ہندوستان سے باہر بے شمار کام رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ گزشتہ چند برس سے لیگ کے ساتھ مثل سابق اُن کا گہرا تعلق نہیں رہا۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے۔ لیکن امید ہے۔ کہ لیگ نہ صرف ہز ہائینس آغا خاں کی اعانت پھر حاصل کرنے کی کوشش کریگی۔ بلکہ اس امر کی بھی سعی کی جائیگی۔ کہ اس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہترین ہستیاں جمع ہو جائیں۔ لیگ کے ممتاز اور برگزیدہ بانیوں نے جو پالیسی اختیار کی تھی۔ وہ یہ تھی۔ کہ ملک کی سیاسی ترقی میں اعانت کی جائے بغیر اس کے کہ مسلمانان ہندوستان کی وہ حیثیت زائل ہو جس کے رو سے اُن کا شمار ملک کی اہم ترین قوموں ہی میں ہے۔ مسلمانوں کے مذہب اور اُن کی تاریخ و ادب میں کئی امور ایسے ہیں۔ جن پر وہ بجا طور پر فخر و ناز کر سکتے ہیں۔ اور وہ اس ورثۂ عظیم کو ہر حالت اور ہر صورت میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں مسلم لیگ ابتدا سے اس امر کی کوشش کرتی رہی ہے۔ کہ مسلمانوں کا موجودہ مرتبہ قائم رہے اور اس کے ساتھ ہی ملک کے مفاد عامہ کی ترقی میں شرکت اختیار کی جائے۔

مسلم لیگ نے کانگریس کے ان مطالبات کی ہمیشہ تائید کی ہے۔ جس
سے اس کے نزدیک مشترکہ ملکی مفاد حاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن جن معاملات
میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض میں اختلاف ہو۔ وہاں لیگ
مسلمانوں کی حمایت کرتی رہی ہے۔ جب کبھی کانگریس اور لیگ نے کسی
معاملہ پر متفق ہو کر زور دیا۔ تو اس ملک کی اور انگلستان کی رائے
عامہ پر اس کا مفید اثر پڑا۔ اور یہ متحدہ طاقت بہت مؤثر ثابت
ہوئی۔ میرے خیال میں اگر کانگریس اور لیگ دونوں اس طریق کار
کو اختیار کئے رہتیں۔ تو بہت مناسب ہوتا۔ اور موجودہ صورت
کی نسبت ان دونوں میں بہت کم کشیدگی ہوتی۔ ہمارے ہاں کے بعض
سر برآوردہ کارکنوں نے ان دونوں مجالس میں کسی قدر زیادہ اتحاد
پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور دونوں انجمنوں کے اجلاس ایک
ہی زمانے میں اور ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔ لیکن اس مصنوعی
طریق کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ لیگ کمزور ہو گئی۔ اور کانگریس کو بھی کچھ نفع
نہ پہنچ سکا۔ اکثر یہ ہوتا رہا۔ کہ جب کانگریس حالات حاضرہ کے
متعلق کچھ قراردادیں پاس کر کے اپنا اجلاس برخاست کر دیتی۔
تو لیگ اسی قسم کی قراردادیں طیار کر کے رسمی طور پر ان کو منظور
کر دیتی۔ اور اس کے اجلاس میں کانگریس کی نسبت بہت قلیل تعداد
میں لوگ شریک ہوتے۔ اس صورت میں لیگ کے اجلاس ایک
نہایت ہی غیر دلچسپ نقل بن گئے۔ اور کچھ عرصہ تک لیگ کی
ہستی کانگریس کی ایک ہلکی سی گونج کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور خود
کانگریس نے جب یہ دیکھا۔ کہ خلافت ترکی کی حفاظت کا سوال
ذرا زیادہ اہمیت پکڑ گیا ہے۔ اور مسلمانوں میں دو نئی جماعتیں پیدا
ہو گئی ہیں یعنی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء۔ تو اس نے ان دونوں

کے ساتھ شرکت عمل کرنے کو زیادہ مفید سمجھا۔ لیکن اس اتحاد کی بنیاد استوار نہ تھی۔ مسلمانوں کو خلافت کے مسئلہ کا بہت زیادہ احساس تھا۔ اور انہوں نے یہ سمجھا۔ کہ تحفظ خلافت میں کانگریس سے ان کو مدد مل سکیگی۔ اُدھر بہت سے ہندو سیاست دانوں نے جنھوں نے مسئلۂ خلافت سے اظہار ہمدردی کیا تھا۔ اس امر کی کوشش کی۔ کہ اپنی اغراض کے لئے مسلم جذبات کے تلاطم سے فائدہ اُٹھا لیا جائے۔ اور ان کی یہ خواہش ہرگز نہیں تھی۔ کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی پائدار اور اصلی اتحاد قائم رکھا جائے ہندوؤں کو عام طور پر اس بات کا یقین تھا۔ کہ ترکی کی طاقت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور دُنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہیگی۔ اس بناء پر ہندو سیاست دان آزادی سے اس مسئلہ سے ہمدردی ظاہر کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ترکی کی ترکی تمام ہو چکی تھی لیکن جب ٹرکی اس کشمکش کے بعد نئی قوت بدلئے ہوئے جانبر ہوئی۔ گو اس کی مملکت کا رقبہ بہت کم ہو گیا تھا۔ تو ہندو کے جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور انہوں نے پھر مسلمانوں کے متعلق وہ مخالفانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ جو مہاتما گاندھی جی کے قوی اثر کی بدولت چندے معطل ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں مہاتما گاندھی کو حقیقت میں مسلمانوں کے احساسات کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اور ان کو اس بات کا یقین تھا۔ کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر کوئی سیاسی ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے بہت سے ہم مذہب اصحاب کو ان خیالات سے اتفاق نہ تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ اس تحریک کا ایک نہایت ہی پُرزور ردِ عمل واقع ہؤا۔ جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی کی پالیسی کی مخالفت ہونے لگی۔ بلکہ شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکات

وجود میں آئیں۔ مہاتما جی نے کچھ عرصے تک ہندوؤں کی اس
غیر خوشگوار بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کی کوشش کی۔ جس میں
فرقہ داری شامل تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اُن کو کامیابی ہوتی۔
اُن کی اپنی مقبولیت جاتی رہی۔ اور انہیں پبلک زندگی سے
قبل از وقت علیحدہ ہونا پڑا۔ ہم میں سے جن اصحاب کو ان کے
تمام خیالات اور سیاسی طریق کار سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا
بھی یہ خیال ہے۔ کہ میدانِ سیاسیات سے ان کی غیر حاضری سے
ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ اور ہم ان کے صلح کُل اثر سے محروم ہوگئے
ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی افسوس ناک ہے۔ کہ ایک اور فراخ
حوصلہ لیڈر یعنی مسٹر سی آر داس آنجہانی کو موت کے بے رحم
ہاتھوں نے ہم سے اُس وقت چھین لیا۔ جب کہ ہندوستان کو
اس قسم کی ہستیوں کی سخت ضرورت تھی۔ مہاتما گاندھی کی طرح
مسٹر داس آنجہانی کا بھی یہ خیال تھا۔ کہ ہندوستان کی ان دو
بڑی جماعتوں کا اتحاد ضروری ہے۔ پس جو کام یہ دونوں عالی
ظرف اصحاب کر رہے تھے۔ وہ رُک گیا۔ اور اُس کی جگہ ایک اور
مخالفانہ تحریک پیدا ہوگئی۔ جس کے حامی پنڈت مدن موہن مالویہ
صاحب اور جناب لالہ لاجپت رائے جیسے صاحبان ہیں۔ جو ہمیں پھر
اسی فضائے سیاسی میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ جس کو ہم
نے اپنی دانست میں ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا تھا۔ ہندو سبھا
کی رجعت پسند پالیسی کے حامیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ
جو مخالفت ہو رہی ہے۔ وہ نہایت کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔ اور ملک
کے لئے بحیثیت مجموعی نقصان دہ ہے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس
ہے۔ کہ جب تک یہ طرزِ عمل جاری رہیگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں

کسی حقیقی اشتراکِ عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مجھ کو امید ہے۔ کہ یہ صورت دیر تک نہیں رہے گی۔ لیکن جب تک موجودہ شکل قائم رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ وہ اپنے حقوق کی منظم حفاظت کریں۔ مسلم لیگ جیسی جماعت پہلے ہی سے ضروری ہے مگر اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ جب یہ نظر آئے۔ کہ اس کا وجود خود ہماری اپنی ہستی کو قائم رکھنے اور اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے بہت ضروری ہے۔ بایں ہمہ ہم کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کہ ہندو سبھا کے طرزِ عمل سے ہم میں انتقام کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو۔ اور اس مخالفت کے باعث ہم حصولِ سوراج کے متعلق اہلِ ہند کے جائز اور آئینی مطالبات کی تائید کرنے سے نہ رکیں۔ کیونکہ اس کو کانگریس اور لیگ دونوں نے ہماری مشترکہ منزلِ مقصود قرار دیا ہے۔

۱۹۱۷ء کے قابلِ یادگار سال کے بعد جبکہ اصلاحات کی تحریک کا آغاز تھا خصوصاً ۱۹۲۰ء کے بعد جبکہ اصلاحات فی الواقعہ نافذ ہو گئیں۔ اور بیشمار مجموں میں سوراج سوراج کی پکار ہوتی رہی ہے۔ آپ حضرات کو علم ہو گا کہ جب اصلاحات کا نفاذ ہوا تھا۔ تو سیاست والوں کے ایک گروہ نے اصلاحات کو بالکل ناکافی خیال کیا تھا۔ اور نئی کونسلوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن ایک دوسرے گروہ نے جس کو عملی طور پر پہلے گروہ سے ان معنوں میں اتفاق تھا۔ کہ اصلاحات ناکافی ہیں اس بات پر زور دیا تھا۔ کہ اصلاحات سے کام لینا چاہیئے۔ خواہ وہ کیسی ہی ہوں۔ مگر آخر الذکر گروہ کی آواز ان کے زیادہ پرشور ہم وطنوں کی آواز سے دب گئی۔ اور اس سے جو نتائج برآمد ہوئے۔ وہ ملک کے لئے غیر مفید ہیں۔ ان دو گروہوں نے طبقۂ عمال سے مقابلہ کرنے کی

بجائے ان کے اختیارات چھیننے کی کوشش کی جگہ آپس میں لڑنا جھگڑنا
شروع کر دیا۔ کانگریس کے انتہا پسند طبقہ نے ان لوگوں کو مطعون کرنا
شروع کر دیا۔ جو اصلاحات سے کام لینا چاہتے تھے۔ اور اس بات
پر زور دیا۔ کہ سلطنت برطانیہ کے دیگر مقبوضات کی مانند یہاں بھی
فوراً حکومت خود اختیاری عطا کر دی جائے۔ یہ حضرات اس پر
رضامند نہ تھے۔ کہ حکومت خود اختیاری کی مزید اقساط لینے سے
قبل مجوزہ امتحانی زمانے کو کامیاب بنایا جائے۔ چنانچہ جدید مجالس
آئینی کے اولین انتخابات میں مذکورہ بالا بائیکاٹ کو خاصی کامیابی
ہوئی۔ لیکن جب دوسری دفعہ انتخابات کا موقعہ آیا۔ تو حامیان
عدم تعاون نے کسی حد تک اپنی اس امتناعی شرط کو نرم کر دیا۔
اور اس بات پر اصرار کیا۔ کہ کونسلوں میں جانے والے اصحاب
صرف کونسلوں کو برباد کرنے کے لئے ممبری قبول کریں۔ مگر اس
میں بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ اور اب ان لوگوں میں سے اکثر جوابی عدم
تعاون کے نام سے کونسلوں میں داخل ہوئے ہیں۔ تحریک عدم
تعاون کے ان تین مراحل کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول
کرانے سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ آپ پر یہ امر روشن ہو جائے۔
کہ اصلاحات میں سرعت کے ساتھ ترقی حاصل کرنے کی ناکام
کوشش میں ہمارے بعض لیڈروں نے فی الواقع اصلاحات کی
ترقی میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اگر ملک کے قابل ترین اصحاب
شروع ہی میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور اصلاحات
سے باوجودیکہ وہ ناکافی تھیں متحد ہو کر کام لیتے۔ تو موجودہ
صورت کی نسبت ملک حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کے
لئے زیادہ تیار ہوتا۔ اور زیادہ وثوق سے کہا جا سکتا۔ کہ اس میں

حکومت خود اختیاری کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ شاہی کمیشن جس کی بابت امید تھی۔ کہ ۱۹۲۹ء میں مسئلہ اصلاحات پر مکرر غور کرنے کے لئے قائم ہو گی۔ اس سے بھی پہلے اپنا کام شروع کر دے۔ لیکن کمیشن کے سامنے جو منظر ہم پیش کرنے والے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہو گا۔ کہ ہندوستانیوں میں اختلاف اور افتراق ہے۔ اور وہ آپس میں بے سود جھگڑ رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات برپا کر رہے ہیں۔ میں ان تمام امور کے لئے کسی خاص جماعت یا کسی خاص شخص پر الزام نہیں لگانا چاہتا۔ میرے خیال میں ہم سب کم وبیش موردِ الزام ہیں۔ اور میں نے ان امور کی طرف محض اس لئے اشارہ کیا ہے۔ کہ میں اپنے تمام ملکی بھائیوں سے یہ التماس کروں۔ کہ موجودہ صورت حالات کی اصلاح کی جائے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وقت نکل جائے۔ اگر ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیانی زمانے میں ہمارا طرزِ عمل گزشتہ چھ برس کی طرح رہا اور معقولیت پر مبنی نہ ہوا۔ تو مجھ کو مستقبل نہایت تیرہ وتار نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ہم آئندہ تین سال کے عرصے میں تخریبی کام کی بجائے تعمیری کام کریں۔ اور ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں نفاق ڈلوانے کی بجائے اتحاد قائم کریں۔ اور اپنے ہاں کی اشتراکی اور اقتصادی زندگی کو سدھار لیں۔ تو میرے خیال میں ہمیں اس بات کا نہایت ہی عمدہ موقعہ مل جائیگا۔ کہ اپنے حقوق اور مراعات میں ایک معتدبہ اضافہ حاصل کر لیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ کو چاہئے۔ کہ بہ حیثیت ملک کی دو سربرآوردہ سیاسی انجمنیں ہونے کے اول تو اس بات کا انتظام کریں۔ کہ

دونوں جماعتوں کے چیدہ چیدہ نمائندے کسی مرکزی مقام پر ایک کانفرنس میں شریک ہوں۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔ جب کہ مشہور و معروف "میثاق لکھنؤ" کی تصدیق ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاحات کی پہلی قسط جو ہمیں ملی ہے۔ اس میں اس باہمی سمجھوتے سے بہت سہولت ہوئی جو ان دونوں اقوام میں طے پایا تھا۔ اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے۔ کہ لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں نے باہمی رضا مندی سے جس تناسب کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی کو مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کے ذمہ وار واضعین نے زیادہ تر اپنے فیصلے کی بنیاد قرار دیا۔ اس کے بعد سے دونوں اقوام میں یہ احساس موجود ہے۔ کہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے میثاق لکھنؤ میں ترمیم ہونی چاہئے۔ یا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم ایک مرتبہ اور آپس میں مشورہ کر لیں۔ تو ضروری ترمیمات کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ کہ اگر کوئی تازہ معاہدہ ہو جائے۔ یا اسی پرانے معاہدے میں جو اصول بنیادی مضمر ہیں۔ ان کی کسی قدر ترمیم کے ساتھ تصدیق ہو جائے۔ تو مزید اصلاحات کے نفاذ میں بہت زیادہ سہولت پیدا ہو جائیگی۔ مگر اس قسم کے اتحاد کے بغیر ہماری مشکلات کا کبھی خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہ کانگریس اس قسم کی تجویز کو کس نظر سے دیکھیگی۔ لیکن میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ ایک ہندوستانی اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اس جلسے میں اس بات کا اظہار کر دوں کہ مسلمان میثاق مذکور کی تصدیق یا تجدید کے لئے طیار ہیں۔ اس کی شرائط کا فیصلہ مناسب غور و خوض کے بعد ہو سکتا ہے۔ اور ہم اپنے ہندو

ہم وطنوں کی طرف دوستی اور رفاقت کا ہاتھ اس امید سے بڑھاتے
ہیں ۔ کہ وہ بھی ہاتھ بڑھا کر دوستی قائم کریں ۔ اور اشتراک عمل کے
متعلق گفت وشنید کریں ۔ اگر کوئی ایسی کانفرنس کبھی منعقد ہو ۔ تو
اس کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو پیش کیا جائیگا ۔ وہ اسمبلی
اور کونسلوں میں اور دیگر پبلک جماعتوں میں مسلمانوں کی کافی نیابت
کے انتظام کے متعلق ہوگا ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت ہے
اسمبلی میں تو ان کی نیابت کو مشکل سے کافی یا موثر کہہ سکتے ہیں
بہت صوبجات میں بھی ان کی تعداد قلیل ہے ۔ وہاں ان کو میثاق
لکھنؤ کے مطابق ان کی آبادی کے لحاظ سے کسی قدر زیادہ نیابت
دی گئی ہے ۔ لیکن اس اضافہ سے مسلمانوں کو اپنی مرضی چلانے
میں تو کوئی اعانت نہیں مل سکتی ۔ مگر یہ ضرور ہے ۔ کہ انہیں اس سے
کچھ اطمینان ضرور ہوتا ہے ۔ ہندوستان کے صرف تین صوبے
ایسے ہیں ۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے ۔ یعنی بنگال ۔ پنجاب
اور صوبہ سرحدی ۔ ان میں سے آخرالذکر میں تاحال اصلاحات
کو نافذ نہیں کیا گیا ۔ میثاق لکھنؤ کے مطابق مسلمانان بنگال کو اس
کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم حصہ ملا ۔ اور ان کا کچھ حصہ اور پنجاب
کا کچھ حصہ ان صوبوں کا تناسب پورا کرنے کے لئے استعمال کیا
گیا ۔ جہاں غیر مسلم اصحاب کی آبادی کثیر تھی ۔ پنجاب میں اور غالباً
بنگال میں بھی اس بات کا بہت احساس ہے ۔ کہ اگر تناسبات
پر مکرر نظر ثانی کی جائے ۔ تو اس اصول کو ملحوظ رکھنا چاہئیے ۔ کہ
ہر ایک صوبے کی قلیل التعداد اور کثیر الافراد جماعتوں کے ساتھ
خواہ وہ ہندو کی ہوں خواہ مسلمانوں کی ۔ یکساں سلوک ہے ۔
جب بہت سے صوبوں میں غیر مسلم اکثریت کو اپنے ہاں کے امور پر

مؤثر انداز میں اثر ڈالنے کا موقعہ دیا گیا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں
کہ دیگر صوبجات میں ایسی مراعات کو روا نہ رکھا جائے۔ جہاں
مسلمانوں کی تعداد کثیر ہو۔ البتہ ہر جگہ قلیل التعداد جماعتوں کے
حقوق کی مناسب حفاظت کا انتظام ہونا چاہئے۔ تاکہ کثیر التعداد
جماعت کو اس بات کا موقعہ نہ مل سکے۔ کہ وہ اپنی تعداد سے ناجائز
فائدہ اٹھالے۔ یا اپنی طاقت کا غلط استعمال کرے۔ میرے خیال
میں اس تجویز کی موزونیت کے متعلق کسی کو بھی بجا اختلاف نہیں
ہوسکتا۔ اور اگر دونوں اقوام اس اصول کو مدنظر رکھیں۔ تو نہایت
مناسب ہے۔ لیکن اس کی راہ میں ایک مشکل حائل ہوگی۔ جس سے
عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ ہندو اصحاب اس بات پر زور دیتے
ہیں۔ اور یہ زور دینا بیجا نہیں۔ کہ اگر مذکورہ بالا طریق پر نیابت
قومی کی نظرثانی کی جائے گی۔ تو ان صوبوں میں سے جہاں مسلمانوں
کی تعداد قلیل ہے۔ اور جہاں ان کی نیابت میں اضافہ کیا گیا تھا۔
اس اضافہ کو واپس لینا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا
کہ کسی مجموعی فیصلہ میں جو سارے ملک کے لئے ہو۔ تو یہ امر قرین
انصاف نہیں ہوگا۔ کہ ہم مذکورہ بالا اضافہ مانگتے ہیں اس صورت میں
جب ہم ان صوبوں میں جہاں ہماری تعداد کثیر ہو اپنے جائز تناسب
کا مطالبہ کریں۔ اس وجہ سے اب بہت سے اصحاب متفق ہوتے جاتے
ہیں۔ کہ بمبئی۔ مدراس اور صوبجات آگرہ و اودھ جیسے صوبوں میں
ہماری نیابت قومی میں جو قلیل اضافہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود بھی
ہماری اقلیت بدستور رہتی ہے۔ اور اس سے کچھ عملی فائدہ نہیں ہوتا
برعکس اس کے بنگال اور پنجاب میں ہماری تعداد عملاً قلیل التعداد
جماعتوں کے برابر پہنچ گئی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ ان صوبوں

کے مسلمانوں پر ہے۔ کہ آیا وہ اپنے اضافہ کو قربان کرنے کے لئے
طیار ہیں۔ جو انہیں ۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے مطابق حاصل ہؤا ۔
اس غرض کے لئے کہ ان کے دیگر بھائیوں کو جن کی دوسرے صوبوں
میں تعداد زیادہ ہے۔ اس سے کچھ امداد ملے۔ اور وہ اپنی تعداد سے
کچھ فائدہ اُٹھا سکیں۔ یا وہ اس مضر اثر کے باوجود جو مسلمانوں کی
آبادی کے ایک حصۂ کثیر پر پڑ رہا ہے۔ موجودہ صورت حالات کو
برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ موجودہ تناسبات کی نگرانی پر مائل
ہوں۔ تو اس سے تمام قوم کو بہ حیثیت مجموعی نفع پہنچ سکتا ہے۔ لیکن
اگر وہ اس برائے نام فائدہ کو ترک نہیں کرنا چاہتے۔ جو انہیں حاصل
ہے۔ تو پھر ہمیں اس فیصلہ پر مردانگی کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔
جو ۱۹۱۶ء میں طے پایا تھا۔ اور موجودہ شکل سے حتی المقدور فائدہ
اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔

اگرچہ تمام معقول ہندو لیڈر عام طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ
مسلمانوں کو ایک مناسب نیابت قومی کا حق حاصل ہے۔ لیکن ان
میں اکثر کا خیال یہ ہے۔ کہ اس نیابت قومی کو مخلوط یا مشترکہ حلقہ جات
نیابت کے ذریعہ دینا چاہیئے۔ اور ہر ایک صوبہ میں مسلمانوں کے لیے
نشستوں کی مقررہ تعداد محفوظ رکھی جائے۔ لیکن ان کا انتخاب مسلم
اور غیر مسلم ووٹروں کے مشترکہ حلقے میں سے ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے۔
کہ اس صورت میں مشترکہ قومیت قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ مدد ملیگی۔
اور ایسے افراد منتخب ہؤا کرینگے۔ جن پر دونوں اقوام کو اعتماد ہوگا۔
میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ یہ تجویز ہندو مسلم انتخابات کے جداگانہ
حلقہ جات کی نسبت جن پر مسلمان بہ حیثیت جماعت اس قدر مصر ہیں
سطحی نظر سے زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض انگریز حضرات

بھی جنہیں ہندوستانیوں کی خواہشات سے ہمدردی ہے - اس نظریہ کو
زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں - اور اکثر یہ کہہ دیتے ہیں - کہ جداگانہ حلقۂ
انتخابات کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے - کہ وہ ایک
ناگزیر عیب ہے - ان کے اس خیال کی وجہ یہ ہے - کہ انہیں ہندوستان
کے حالات کا کافی علم نہیں ہے - وہ یہاں کے حالات کا اندازہ انگلستان
کے معیار سے لگاتے ہیں - جہاں صدیوں سے مشترکہ قومیت کا
مطمح نظر موجود ہے - اور اسی مطمح نظر میں وہاں کی مشترکہ زبان اور
تہذیب سے مزید پختگی اور استواری پیدا ہو گئی ہے لیکن ہندوستان
میں ابھی حقیقی معنوں میں قومیت کی تشکیل ہونی باقی ہے - اور اس
تشکیل سے پہلے ہمیں ان بے شمار عقدوں کو حل کرنا ہوگا - جو
ذات پات کے اختلاف اور مذہب و تہذیب کے تضاد اور رہنے
سہنے اور کھانے پینے کے جداگانہ طریق کے باعث موجود ہیں یہاں
نہ صرف کئی زبانیں مروج ہیں - بلکہ ہر ایک زبان کے شیدائی اس
اس بات پہ اصرار کرتے ہیں - کہ ان کی محبوب زبان کو ہر جگہ اور
کل اغراض کے لئے استعمال کیا جائے - اس قسم کے حالات میں
یہ توقع فضول ہے - کہ یورپ کے نظریات ہندوستان کے لئے
مفید ثابت ہونگے - جہاں مختلف قومیں آباد ہیں - میں مغربی
صاحبان کو یقین دلا سکتا ہوں - کہ ہندوستان کے مسلمان اس
خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں - کہ مغربی سیاسیات کی بہترین چیزوں
کو حاصل کریں - اور اپنے ہاں صحیح معنوں میں نیابت قومی کا انتظام
کریں - لیکن عملی میدان میں وہ سب مغربی اصولوں پر بے سوچے بغیر عمل
نہیں کر سکتے - کہ آیا وہ اس ملک کے مخصوص حالات کے موافق ہیں
یا نہیں - جہاں تک ہمارے ہندو بھائیوں کا تعلق ہے - مجھ کو اب تک

یہ نہیں معلوم ہوسکا۔ کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ان کی مخالفت کس بناء پر ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ موجودہ صورت حالات میں مشترکہ انتخاب سے اکثر اوقات صرف ایک ہی فریق کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں تو حلقۂ انتخاب کے اندر شدید تنازعات رونما ہو جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جداگانہ طریق انتخاب کے فوائد ظاہر ہیں۔ یعنی انتخاب کے موقعہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں غیر ضروری شکر رنجی پیدا نہیں ہوتی۔ اور مقابلہ صرف ایک ہی قوم کے افراد تک محدود رہتا ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات سے کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ جو ہندوؤں کو نہیں ملتا۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہوسکتا ہے۔ کہ دونوں قومیں جداگانہ طریق انتخاب کو مان لیں۔ تاوقتیکہ اس کو ترک کردینے کی مشترکہ خواہش نہ ہو۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ جن کا یہ خیال ہے۔ کہ یہ طریق ہمیشہ کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔ مگر یقیناً میری رائے یہ ہے۔ کہ اس طریق انتخاب کو اس وقت تک ضرور بحال رکھا جائے۔ جب تک شک وشبہ اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا موجود ہے۔ جس کے لحاظ سے یہ ضروری ہے۔ کہ مختلف قوموں میں امن وامان قائم رکھنے کے لیئے جداگانہ طریق انتخابات کو جاری رکھا جائے۔ بعض حلقوں میں اس رائے کا اظہار کرنا معمول ہوگیا ہے۔ کہ یہاں کی تمام مشکلات اور موجودہ ہندو مسلم کشیدگی کا باعث جداگانہ انتخابات ہیں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات گمراہ کن نہیں ہوسکتی۔ اور مجھ کو امید ہے کہ جملہ بہی خواہان ملک عام اس سے کہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی سرکاری ہوں یا غیر سرکاری اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے خالی الذہن ہوکر غور کرینگے۔ اور جملہ پہلوؤں پر کامل غور وخوض کے بعد کسی صحیح نتیجہ

پر پہنچ سکیں گے۔ حضور والیسرائے بہادر کی تازہ تقریروں سے مسلمانوں میں ایک قسم کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ شاید وہ جداگانہ طریق انتخاب کے خلاف ہیں۔ میں اس موقعہ پر یہ امر حکومت ہند اور حکومت انگلستان کے ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے۔ کہ موجودہ حالات میں ان کے حقوق کی حفاظت صرف اس طرح ہو سکتی ہے۔ کہ ان کے لئے جداگانہ حلقہ جات انتخابات کو قائم رکھا جائے۔ تاوقتیکہ ان کے ہندو بھائی ان کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں جو از روئے انصاف موزوں ہو۔ اس قسم کی حفاظتی تدابیر اور دیگر امور تحفظ موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں ❋

کونسلوں میں اور دیگر جماعتوں میں مسلمانوں کی نیابت سے ملتا جلتا ایک اور ما بہ النزاع مسئلہ ہے۔ جس کے لحاظ سے مسلمانوں کی حیثیت کا بعض اوقات سرکاری افسران اور بعض اوقات ہمارے ہندو ہم وطن اور بعض اوقات دونوں کے دونوں بہت کچھ غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ دعوے ہے۔ کہ ہمارا یہ حق ہے۔ کہ ملک کے نظم و نسق میں مناسب حصہ انہیں دیا جائے۔ حقیقت میں یہ وہی مطالبہ ہے۔ جو ایک مدت سے کانگریس تمام ہندوستان کی طرف سے پیش کرتی رہی ہے۔ جب اس قسم کا مطالبہ یوروپین افسروں کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس ہندوستانی مطالبہ کا جواب سرکاری طبقہ کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا۔ کہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر یوروپین اصحاب کے زیادہ تناسب کی وجہ رنگ یا قوم کا امتیاز نہیں۔ بلکہ اس کا یہ سبب ہے۔ کہ ان میں اعلیٰ قابلیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ فرائض مفوضہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ کانگریس نے اس خیال کی صحت پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اب یہ تسلیم کیا جا رہا ہے۔

کہ ہندوستان میں قابل یا ذہین افراد کی قلت نہیں ہے۔ اور ہر ایک محکمہ کی ملازمت کے لئے لائق اور قابل اشخاص مل سکتے ہیں۔ یہ عجیب بدقسمتی ہے۔ کہ تقریباً پچاس سال تک ہندوستانیوں کی قابلیت کو تسلیم کرانے کی کوشش کے بعد ہمارے بعض ہندو ہم وطن جو کانگریس کے رکن بھی ہیں۔ یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں صرف انہی کی قوم کے افراد قابل ہوتے ہیں۔ اور حکومت کے عہدوں پر ہنود کی اکثریت اس بناء پر چاہتے ہیں۔ کہ مسلمان لیاقت نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے۔ کہ مسلمانوں کی نسبت تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور جب کسی سرکاری محکمہ میں کوئی اسامی خالی ہوتی ہے۔ تو ہندو امیدواروں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے اسباب ظاہر ہیں۔ ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ ان کے ہاں بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اور جہاں تک کہ مغربی تعلیم کا تعلق ہے۔ انہوں نے اس کے حصول میں بہت پہلے سے ابتدا کی ہوئی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اکثر یونیورسٹیوں میں مسلمانوں نے اس بات کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ کہ اگر کسی فرد واحد کا کسی دوسرے سے مقابلہ کیا جائے۔ تو مسلمان ذہنی اور دماغی قابلیت کے لحاظ سے اپنے کسی ہندو ہم وطن سے کم نہیں۔ اور مختلف مضامین کے مطالعہ میں مسلمانوں نے انکی برابری کا ثبوت بھی دیا ہے۔ پس اگر ان کے ساتھ انصاف برتنے کے اصول کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا جائے۔ تو بہت سی ناراضگی اور اور رشک و رقابت کا سدِ باب ہو جائیگا۔ جو آجکل موجود ہے۔ اور جو موجودہ شکر رنجی کے سببوں میں سے ایک سبب ہے۔ آپ کسی خاص سرکاری عہدہ کے لئے کوئی خاص معیار قابلیت قائم کر لیجئے۔

اور ہندو مسلم اقوام اور دیگر اقوام کے تناسب کو کسی خاص صوبے کی ملازمت کے لحاظ سے مقرر کیجئے۔ جو محکمہ یا صوبے کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اس کے بعد اس امر کی سرگرم کوشش کی جائے۔ کہ ہر قوم کو حقیقۃً مناسب ملے۔ بشرطیکہ وہ مطلوبہ قابلیت کے امیدوار مہیا کر سکے۔ امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں صرف یہی نہیں دیکھنا چاہئے۔ کہ انہوں نے کس درجے میں امتحان پاس کئے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں۔ کہ امتحانوں سے ان کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں معقول مدد مل سکتی ہے۔ بلکہ ان کے دیگر اوصاف کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ جو عملی زندگی میں کچھ کم مفید نہیں ہوتے مثلاً چال چلن۔ خاندانی روایات اور جسمانی قابلیت وغیرہ۔

اس سلسلے میں اگر میں ایک اور عام غلط فہمی کا جو سرکاری ملازمت کے متعلق پائی جاتی ہے۔ ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ بعض اخبارات نیز بعض سیاست دان یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ سرکاری ملازموں میں مختلف اقوام کے تناسب نیابت پر زور دینا حب الوطنی سے بعید ہے۔ اور یہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ کہ ملازمت سے ملک کی آبادی کے ایک فیصدی حصہ کو بھی روزگار نہیں مل سکتا۔ اور ہم کو چاہئے۔ کہ ۹۹ فیصدی کے مفاد کو مدنظر رکھیں۔ جو گورنمنٹ کی ملازمت کئے بغیر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس دلیل کو چند سال گزرے۔ اسی شہر میں میرے ایک پیشرو نے اسی لیگ کے جلسے میں پیش کیا تھا۔ اب تو غالباً انہوں نے اپنی رائے کو بدل لیا ہوگا۔ لیکن اگر ان کی رائے میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ تو میں نہایت ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرونگا۔ کہ مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ سرکاری ملازمت کا سوال محض روٹیوں کا سوال ہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔

بلکہ قوت۔ موقعہ اور تربیت کا۔ اس ملک میں سرکاری ملازموں کو عموماً
بہت زیادہ اقتدار حاصل رہا ہے۔ اور اب بھی باوجودیکہ زمانہ بدل
گیا ہے۔ ان کو بہت سے اختیارات حاصل ہیں۔ جنہیں وہ کسی قوم
کے نفع کے لئے یا کسی قوم کے نقصان کے لئے استعمال کر سکتے ہیں
اور اس قسم کے موقعوں پر متعلقہ جماعتوں کے لئے یہ دیکھنا نہایت
ہی ضروری ہوتا ہے۔ کہ کسی خاص وقت پر یا کسی خاص مقام پر
ذی اختیار اشخاص کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ذی اختیار
حضرات کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے۔ کہ جسے چاہیں مدد دیں۔ اور
اگر اس قسم کے مددگاروں کی تعداد کسی جماعت میں زیادہ ہو۔
تو اس کا اثر نہ صرف قوم کی موجودہ حالت پر پڑتا ہے۔ بلکہ اس
سے مستقبل بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔ مزید براں اگر یہ سوال محض روٹیوں
ہی کا ہو۔ تو بھی اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ خیال کرنا
چاہیئے۔ کہ اس کا اثر صرف چند لوگوں پر پڑے گا۔ ہندوستان
میں اکثر یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص جو اپنے خاندان کے لئے روزی
کماتا ہے۔ اپنے دیگر عزیزداروں اور متعلقین کا بھی کفیل ہوتا ہے۔
پس آپ دیکھ لیں۔ کہ اگر ملازمت میں ہزار آدمی ہیں۔ تو ان سے کئی
ہزار آدمیوں کو نفع پہنچ سکتا ہے۔ اور اگر مسلمانوں کی حالت کو دیکھا
جائے۔ تو یہ مسئلہ ان کے لئے اور بھی زیادہ اہم نظر آئیگا۔ کیونکہ ان کیلئے
تجارت اور سوداگری کے راستے بہت کچھ مسدود ہیں۔ کیونکہ ایک تو
ان کے پاس کافی سرمایہ نہیں ہے۔ اور دوسرے زندگی کے ان شعبوں
سے ہندوؤں کو باعتبار تربیت زیادہ مناسبت ہے۔ پس یہ ضروری
بات ہے۔ کہ گورنمنٹ اور ہمارے ہم وطن ہمارے اس مطالبہ کو کہ ہمیں
سرکاری عہدوں میں مناسب حصہ دیا جائے۔ از روئے انصاف جائز

اور مناسب خیال کریں ۔ ختم

ان دو اہم معاملات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ مذہبی اختلافات
کا سوال ایک ایسا سوال ہے جس پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنا
ضروری ہے کہ اصولاً مذہب امن و امان قائم رکھنے کا ذریعہ ہونا چاہئیے ۔ لیکن
بسا اوقات امن و امان رکھنے کی بجائے دنیا میں تکالیف مذہب
کی بناء پر پیدا ہوتی رہی ہیں ۔ چنانچہ ہندوستان کو بھی اس اختلاف
مذہبی سے بہت نقصان پہنچا ہے ۔ اس بات کی وقتاً فوقتاً کوشش ہوتی
رہی ہے ۔ کہ ہندوستان میں مذہبی اختلاف کی بناء پر جو تنازعات
پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کا سدباب کیا جائے ۔ لیکن یہ کوشش اکثر بے سود
ثابت ہوئی ہے ۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے ہوئے ہیں ۔ جو یہ خواب
دیکھتے تھے ۔ کہ ہندوستان کا مذہب عمومی اسلام ہو جائے ۔ اسی
طرح ہندوؤں کے بعض طبقوں میں اس وقت کچھ لوگ یہ خواب دیکھ
رہے ہیں ۔ کہ اگر وہ کافی کوشش کریں ۔ تو اسلام کے سب پیرو ہندو
ہو جائیں ۔ اور اس طرح ایک نئی قوم پیدا ہو ۔ مگر میرے خیال میں
جانبین کو یہ سمجھ لینا چاہئیے ۔ کہ ان دونوں مذہبوں کو ایک دوسرے
کو تباہ کرنے کی کوشش کی بجائے پہلو بہ پہلو رہنا ہے ۔ مسلمان بالعموم
اپنے مذہب کو ایسا عزیز رکھتے ہیں ۔ کہ وہ کسی دنیاوی غرض کیلئے
اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے ۔ اور اسی طرح ہندو جن میں
اب نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے ۔ اور جو اپنے قدیم فلسفہ کی خوبیوں
کو محسوس کر رہے ہیں ۔ اپنا مذہب بدلنے کو تیار نہیں ہونگے ۔ اس
واسطے فریقین کے لئے معقول طریق یہی ہے ۔ کہ وہ باہمی رواداری
اختیار کریں ۔ اور ایک دوسرے کے جذبات کو ملحوظ رکھیں ۔ ہماری
بہت سی تکالیف جو ہمیں پیش آئی ہیں ۔ رونما نہ ہوتیں ۔ اگر ہم میں

رواداری ہوتی۔ مساجد کے سامنے باجہ بجانے کا سوال جس سے حال میں اسقدر بدمزگی پیدا ہوئی ہے۔ ناروا داری کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس قسم کے مسئلہ کے متعلق عوام کا جوش تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن یہ تعجب کا مقام ہے۔ کہ ہندوؤں میں بعض سیاسی لیڈر اس بات پر اصرار کرتے ہیں۔ کہ مساجد کے آگے باجہ بجانا چاہیے خواہ نماز کا بھی وقت ہو ہندوؤں کا حق ہے۔ اور اسی طرح یہ تعجب خیز ہے۔ کہ کچھ مسلمان لیڈر ایسے ہیں۔ جو کہتے ہیں۔ کہ باجے والا کوئی جلوس مسجد کے سامنے سے کسی وقت بھی نہ گزرے۔ ہندوؤں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ رواج یا قانون کے مسئلہ کو الگ رکھ کے بھی محض انسانیت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ اگر آپ کسی عبادت گاہ کے پاس سے گزر رہے ہوں تو مؤدبانہ گزریں۔ خاص کر جب اس کے اندر لوگ عبادت میں مصروف ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ یورپین لوگ اگر کسی ایسی جگہ کے پاس سے گزریں۔ جہاں کوئی معمولی مجلس ہو رہی ہو۔ تو وہ دبے پاؤں گزرتے ہیں۔ کہ شور نہ ہو۔ اور لوگوں کی توجہ نہ بٹے۔ اور یوروپین پر کیا منحصر ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی جو اخلاق سے باخبر ہیں۔ ایسے موقعہ پر اسی طرح خاموشی سے گزرتے ہیں۔ کوئی ایسا قانون نہیں ہے۔ جو انہیں اس فعل پر مجبور کرتا ہو۔ مگر جو شخص ایسا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ اپنے حسن تربیت کا ثبوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس کی اس روش کو دیکھتے ہیں۔ وہ اس کی عزت کرتے ہیں۔ پس ہندوؤں کو عبادت گاہوں کے متعلق یہی خیال اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور نماز پڑھنے والی جماعتوں کا بھی کم از کم وہی لحاظ کرنا چاہیئے۔ جو کسی دنیاوی مجمع کا کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ذرا ذرا سی بات پر

ناراضی ہونے کا طریقہ جو آجکل رواج پاتا جاتا ہے۔ اور خواہ مخواہ ہر موقعہ پر یہ سمجھنے کا میلان بھی کہ دوسرا فریق ہماری ہتک کے درپے ہے۔ ترک کرنے کے قابل باتیں ہیں۔ دہلی کے سکھوں نے تھوڑے دن ہوئے اپنے ایک جلوس کے متعلق بہت اچھی مثال قائم کی ہے۔ اور نہ صرف یہاں کے مسلمانوں کو بلکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کو ممنون کیا ہے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس قسم کے نامناسب جھگڑوں سے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن میں ایک فریق تو اس پر اصرار کرے۔ کہ عبادت گاہ کے سامنے جتنا شور ہو سکے مچائیں۔ اور دوسرا فریق اس شور کو زور سے روکنے کی کوشش کرے۔ ہم لوگ جس قدر جلد اس قسم کی گمراہ کرنے والی تجویزوں کے اثر سے باہر نکل سکیں۔ تو بہتر ہو گا۔

ایک اور مذہبی مسئلہ جو باجے کے اس مسئلہ سے پرانا ہے۔ وہ گائے کی حفاظت کا سوال ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے۔ کہ اس معاملہ میں ہندو بہت تیز احساس رکھتے ہیں۔ مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ کہ اس معاملہ میں کون حق بجانب ہے۔ میں تو فقط یہ جتانا چاہتا ہوں۔ کہ اگر گاؤکشی سال کے ۳۶۴ دنوں میں نہیں رک سکتی۔ تو کیا سبب ہے۔ کہ جب مسلمان مذہبی رسم کے طور پر سال میں ایک دن اس کا ارتکاب کریں۔ تو اس سے اس قدر اشتعال پیدا ہو۔ بے شک ہندوؤں کا یہ مطالبہ درست ہے۔ کہ ایسے موقعوں پر ان کے جذبات کا احترام ملحوظ رہے۔ اور نہ لوگ گوشت علانیہ طور پر ادھر ادھر لے جائیں۔ اور نہ گاؤکشی علانیہ طور پر کریں۔ لیکن اگر ایسے موقعوں پر مسلمان احتیاط کے ساتھ اپنے مکانوں کی چار دیواری کے اندر قربانی کی رسم ادا کریں۔ تو اس میں کوئی معقول

محبت نہیں ہونی چاہیئے ؀

اور معاملات کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک اور مضمون جو ہندو مسلم تعلقات سے متعلق ہے۔ قابل ذکر ہے۔ ہندو اخبارات اور بعض ہندو مقررین اکثر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو اپنے وطن کے معاملات سے کافی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے کہ انہیں بیرون ملک کے مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں۔ جو افغانستان یا کسی اور اسلامی سلطنت کو ہندوستان میں لاکر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میرے علم میں کوئی ذمہ وار حیثیت کا مسلمان ایسا نہیں جو ایسے عجیب خیالات اپنے دماغ میں رکھتا ہو۔ یا انہیں ممکن العمل سمجھتا ہو۔ بلکہ بعض ایسے مسلمان ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر ایسا امکان ہو بھی تو اس سے ہندوستان کے سب باشندوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ یہ خیال بعض ایسے دماغوں کا نتیجہ ہے۔ جن میں غلط خیالات نے ہیجان پیدا کر دی ہے۔ اور یہ پروپاگنڈا اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ ہندو قومیت کے جذبات سے ہٹ جائیں اور انہیں اس طرح ڈرا کر فرقہ بندی کا مطلب پورا کیا جائے۔ مسلمانوں کو جو ہمدردی دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہے۔ وہ اسی قسم کی ہے۔ جیسے یورپ کی عیسائی قوموں کو دوسری عیسائی قوموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب وہ تکلیف میں ہوں۔ اور یہ بالکل قدرتی ہے۔ اس سے کوئی خلل اس قدرتی محبت میں واقع نہیں ہوتا۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی سرزمین پیدائش کے ساتھ اور جسے ان کی اپنی ضروریات و اغراض کے زبردست بندھن نے اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے۔ کہ ہمارے ہم وطن صداقت سے ہمارے اس قول پر اعتبار

کریں گے۔ جب ہم انہیں یقین دلائیں۔ کہ ہم اپنے مقاصد سے مکمل وابستگی رکھتے ہیں۔

میں نے ملکی اقوام کے باہمی تعلقات کے عملی پہلوؤں پر مفصل بحث اس لئے کی ہے۔ کہ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل پیدا ہو۔ اب میں بعض دیگر ضروری معاملات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو غور کے قابل ہیں۔ پہلے اس کمیشن کو لیتا ہوں۔ جو اصلاحات کے متعلق آئیگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب فریقوں کو یہ تسلیم کرنا چاہیئے۔ کہ یہ اصلاحات اب جانے والی نہیں ہیں۔ چاہے ہم ان کو پسند کریں یا نہ کریں۔ جب یہ پہلے پہل آنے کو تھیں۔ تو مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد یہ اندیشہ رکھتی تھی کہ ان کی بہتری ان اصلاحات میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنے زیادہ ترقی یافتہ ہم وطنوں کے مقابلے میں ان سے عملی فائدہ اٹھانے کے لئے پوری طرح طیار نہ تھے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ یہ اندیشہ بے بنیاد نہ تھا۔ اور اس اصلاحات کے زمانے میں مسلمانوں کے اغراض کو ان صوبوں میں بھی کچھ نقصان پہنچا ہے۔ جہاں ان کی کثرت تھی۔ مسلمانانِ بنگال یہ محسوس نہیں کرتے۔ کہ کونسل کی توسیع سے جدید سکیم میں انہیں کچھ نفع ہوا۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بابت گو عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اپنے صوبے کی کونسل میں ان کی حالت مضبوط ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ جو حالت ان کی اصلاحات سے پہلے تھی۔ اس سے وہ کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ بلکہ بعض لحاظ سے ان کی حالت کمزور ہو گئی۔ گو ہندو اخبارات یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کہ انہیں صوبہ پنجاب میں بہت سی شکایات ہیں۔ لیکن ایسے بیانات زیادہ تر کاریگری سے

پروپاگنڈا کے طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔ مگر واقعی ان کی اصلیت کچھ نہیں۔ نئی اسکیم میں ایک تبدیلی پنجاب میں یہ واقع ہوئی ہے۔ کہ سکھوں نے ہندوؤں سے علیحدہ ایک جدا قومیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے۔ جب پنجاب کے ہندو صاحبان اس قسم کے خیال پر اعتراض کرتے تھے۔ اور گورنمنٹ کو الزام دیتے تھے۔ کہ وہ سکھوں کو ہندوؤں سے جدا کر کے ہندوؤں کو کمزور کرنا چاہتی ہے۔ اور تعلیم یافتہ سکھ بھی یہ کہتے تھے۔ کہ وہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں صرف ایک فرقہ ہیں۔ مگر وہ ان سے جدا نہیں ہو سکتے۔ حقیقت تو آج بھی وہی ہے۔ جو پہلے تھی۔ مگر کونسل میں جداگانہ حیثیت حاصل کرنے کا شوق اور انتظام ملک میں معقول حصہ اپنے تناسب آبادی سے بڑھ کر لینے کی امید اسی دعوے کا باعث ہوئی۔ گورنمنٹ بھی اپنے مطالب کے لئے اس دعوے کو ماننے پر راضی ہو گئی ہے۔ اور ہندو بھی اس لئے اس کی تائید کرتے ہیں۔ کہ عملاً ان کی حالت زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس سے پنجاب کی حالت میں ایک پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا مسلمانوں کی اغراض پر بہت اثر پڑ رہا ہے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی طاقت کا جس کا بظاہر بہت شہرہ ہے۔ اس سے ایک اندازہ لگ سکتا ہے کہ سال حال میں جواب ختم ہونے کو ہے۔ پنجاب میں کوئی مسلمان وزارت کے عہدے پر موجود نہ تھا۔ صرف اس بناء پر اس عرصے میں گورنمنٹ نے اگزیکٹو کونسل کی ممبری کا عہدہ آنریبل میاں سر فضل حسین جیسے آزمودہ کار منتظم اور قابل شخص کے سپرد کیا۔ جو سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کے پانچ سال اس عہدہ پر رہنے کے بعد مقرر کئے گئے۔ مسلمان انجمنوں اور اخباروں نے اس حالت کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر

اس کی پروا نہیں کی گئی۔ اور یہ مزید افسوس کا مقام ہے۔ کہ اب
جو کونسل بنی ہے۔ اس میں بھی مضامین منتقلہ کے انتظام میں مسلمانوں
کا کوئی حصہ غالباً نہیں ہوگا۔ مگر باوجود ان مشکلات کے میری رائے
ہے۔ کہ ہمیں جو موجودہ حالات ہیں۔ ان کے مطابق اپنے مواقع پیدا
کر لینے چاہئیں۔ اور اس مفروضہ کے رو سے کام کرنا چاہیئے۔ کہ اب
اصلاحات سے پیشتر کے زمانے کیطرف عود کرنا ممکن نہیں۔ ہمیں چاہیئے
کہ ہم آئینی طور پر اصلاحات میں اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کے
لئے طیار ہو جائیں۔

میرے خیال میں جو نقصانات ہمیں پہنچے ہیں۔ ان کے ہم خود ہی
زیادہ تر ذمہ دار ہیں۔ اول تو ہم کافی طور پہ مجتمع اور متحد نہیں اور جب
تک ہم اپنی اس کمزوری کو رفع نہیں کرینگے۔ ہم کبھی زیادہ مضبوط اور
منضبط قوموں کے مقابلے میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اپنے اس
لیگ کی کل کے پرزوں کی تجدید و تکمیل کرنی چاہیئے۔ اور پھر کمیشن کے
روبرو ملکی خود مختاری میں اپنا حصہ حاصل کرنیکا مطالبہ کرنا چاہیئے۔
ہمیں یہ بھی دعویٰ کرنا چاہیئے۔ کہ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے۔
وہاں کونسلوں میں ہماری اکثریت قائم ہو۔ اس بات پہ بھی زور دینا
چاہیئے۔ کہ صوبہ سرحدی کو اصلاحات دی جائیں خاص کر اس لئے کہ
آبادی کا کثیر حصہ ایک قسم کا ہونے کیوجہ سے وہاں اصلاحات کے کامیابی
سے چلنے کی اور صوبوں سے زیادہ امید ہو سکتی ہے۔

اجتماعی انضباط (آرگینائزیشن) کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگرچہ
آل انڈیا لیگ اور اس کی بعض صوبہ وار شاخیں باوجود نامساعد حالات
کے اپنی ہستی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ انکی
ضلع وار شاخیں اکثر عملی طور پہ بند ہیں۔ اب جو ہم اپنے گھروں کو واپس

جائیں - تو ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے - کہ ہر جگہ کام کرنیوالی شاخیں
قائم کی جائیں - ہمیں یہ بھی لازم ہے - کہ نہ صرف لیگ کے معمولی کاروبار
کو چلانے کے لئے کوئی فنڈ بہم پہنچائیں - بلکہ وسیع پیمانے پر اس کے
پروپاگنڈا چلانے کے خرچ کے لئے روپیہ فراہم کریں - آجکل کوئی تحریک
ایسے وسائل کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی - اور ہم کو اس ضروری فرض سے
اب زیادہ غافل نہیں رہنا چاہیئے - جب لیگ کی اس تکمیل سے فارغ
ہو چکیں - تو ہمیں یہ کوشش کرنی ہوگی - کہ جو اور تحریکیں مشغول کار ہیں -
اس میں اور ان کے کاموں میں باہم ربط قائم ہو - امرتسر میں پچھلے ۱۹۲۵ء
میں ہمارے مکرم ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو نے ایک کانفرنس مختلف
جماعتوں کی منعقد کی تھی - اس کا یہ فیصلہ بہت معقول تھا - کہ مسلمانوں
کی مختلف جماعتیں باہم رقابت کو ترک کریں - اور اپنا اپنی جگہ قوم کی
خدمت کر کے ایک دوسرے کو مدد دیں - قرارداد یہ تھی - کہ سیاسی میدان
میں مسلمانوں کے انضباط کا کام لیگ کرتی رہے - اور خلافت کے کام
کا بیشتر حصہ ان تعلقات سے واسطہ رکھے - جو ہندوستانی مسلمانوں
اور دیگر ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان ہے - تعلیمی انجمنیں بدستور تعلیم
کی فکر میں مصروف رہیں - اور جمعیت العلماء مذہبی امور کی نگہداشت
کرے - تنظیم کی جدید تحریک کے لئے قوم کی تمدنی اور اقتصادی حالات
سنوارنا مخصوص کیا گیا تھا - اگر وہ لیڈر صاحبان جو امرتسر میں جمع
ہوئے تھے - عملی طور پر اس تجویز کے چلانے میں مصروف ہو جاتے - تو قوم
کے لئے بڑی خوش قسمتی کا موجب تھا - مگر ایکدوسرے کے خاص کاموں
میں مداخلت ختم نہیں ہوئی - اور بسا اوقات رہنماؤں کے اپنے اپنے
میلان اور شوق قومی اغراض پر غالب آتے رہتے ہیں - نوبت یہانتک
پہنچی ہے - کہ مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کی بعض صوبجاتی شاخیں ایک

دوسرے سے الگ ہیں۔ اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہے۔ کہ مرکزی خلافت
اور صوبہ پنجاب کی شاخ کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اور اخباروں میں
ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہا جا رہا ہے۔ ایک اور افسوسناک جھگڑا دہلی میں
بعض سرگروہ رہنماؤں کے درمیان چل رہا ہے۔ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہم
سب کو ان تحریرات کو دیکھ کر رنج ہوا ہے۔ جو اس ناگوار مباحثے کے اثناء
میں شائع ہو رہی ہیں بعض ایسے الفاظ اخباروں میں چھپتے ہیں۔ کہ
عامیوں کو بھی انہیں منہ سے نکالتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں ان سب سے
جنہیں ایسی تحریروں سے تعلق ہے۔ اپیل کرتا ہوں۔ کہ وہ اگر اخباروں
کے ناظرین کے اخلاق کا نہیں تو اپنے مناصب کا لحاظ کریں۔ ایک فریق
کہتا ہے کہ میں دوسرے کو کچل ڈالوں گا۔ اور یہ کچلنا اس غرض سے ہوگا۔
کہ قوم دوسرے کے نقصان سے محفوظ ہو جائے۔ مگر مجھے یہ ڈر لگتا
ہے۔ کہ بھائیوں بھائیوں کی اس خانہ جنگی سے خود قوم کو نقصان
ہوگا۔ ؎ آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

اگر کوئی وفد اس مطلب کے لئے تیار ہو۔ یا کوئی بہت سے دستخطوں
والی درخواست طیار کی جائے۔ جو فریقین سے یہ درخواست کرے
کہ اس باہمی جھگڑے کو بند کر کے دونوں قومی خدمت میں وقت
صرف کریں۔ کیونکہ قوم کو ٹھوس کام کی بے حد ضرورت ہے۔ اور
بے سود مناقشوں میں صحت صرف کرنے کی توفیق نہیں رکھتی۔
ڈاکٹر کچلو صاحب کے حق میں اس بارے میں آفریں کہنا زیبا ہے
کہ جب سے انہوں نے قوم کے لئے تعمیری کام کرنے کی ضرورت کو محسوس
کیا ہے۔ اور تنظیم کی تحریک شروع کی ہے۔ انہوں نے یہ مفید خیال
ہر وقت اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس تحریک کے کھیل میں جو

بعض جگہ چل رہا ہے۔ کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔ مگر یہ افسوس ہے کہ
تنظیم نے وہ ترقی نہیں کی۔ جس کی امید تھی۔ جس کی ایک وجہ تو یہ
ہے کہ قوم ٹھوس کام کرنے کی قدردانی کی عادت کافی طور پر نہیں
رکھتی۔ اور دوسری یہ کہ عملاً ڈاکٹر کچلو صاحب کو تنہا کام کرنا پڑا۔
اور بہت سے وہ لوگ جو اس زمانے میں اس کے حامی تھے۔ جب
وہ انقلاب کے قائل تھے۔ اب ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ جب
انہوں نے ارتقائی کوشش کو اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ ایک اور
تحریک قابل ذکر ہے۔ یعنی تبلیغ۔ اصولی طور پر تو اسلام میں یہ
ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ مگر زمانہ حال میں شدھی کی تحریک کے
جواب کی حیثیت سے اس پر زور دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس
کی زبانی تنظیم تو بہت ہوئی۔ مگر مالی مدد ان زبانی باتوں کی نسبت سے
بہت ہی کم ملی۔ میں اس تحریک کے حامیوں کو ایک چھوٹا سا مشورہ دینے
کی جرأت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اگر وہ دنیا کو اسلام کا پیغام
حق پہنچانا چاہتے ہیں۔ تو وہ اسے حقیقی معنوں میں صلح و سلامتی کا
پیغام بنائیں۔ اور لوگوں کو اپنے مذہب کی خوبیاں دکھا کر اسکی
طرف کھینچنے کی کوشش کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسرے مذہبوں
کی اصلی یا خیالی کمزوریاں ظاہر کرنے میں مصروف ہوں۔

مسلمانوں میں جو مختلف تحریکیں جاری ہیں۔ ان کا کچھ ذکر ہو لیا۔
اب میں بیرونی واقعات میں سے ایک ایسے معاملے کی طرف آتا ہوں۔
جس نے مسلمانوں پر سال رواں میں بہت گہرا اثر کیا۔ یہی وہ سال
ہے جس میں امیر ابن سعود شاہ حجاز بن کر برسر اقتدار ہوئے۔ معمولی
طور پر تو یہ توقع تھی۔ کہ مسلمانان ہند عرب میں کسی منتظم حکومت
کے قائم ہونے پر مطمئن ہونگے۔ کیونکہ اس سے انہیں امن و آرام کے

ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کا موقعہ ملیگا۔ مگر بدقسمتی یہ واقعہ پیش آیا۔ کہ سلطان ابن سعود کی فوج نے بعض مقدس مقبروں کے گنبد توڑ دئیے۔ اور اس سے اس ملک کے مسلمانوں میں بہت اضطراب پیدا ہو گیا۔ یہ مشکل اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے سبب سے مسلمانان ہند دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ گنبدوں کے انہدام پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور دوسرا ابن سعود کی حمایت کرتا ہے اور اس فعل کو مذہب کے مطابق بتاتا ہے۔ یہ بحث اب تک جاری ہے۔ اور اس کی بدولت حنفیوں اور اہل حدیث میں اس قدر تفرقہ پیدا ہوا ہے۔ کہ موجودہ صدی کے آغاز سے اس وقت تک نہیں پیدا ہوا تھا۔ گزشتہ چند مہینوں میں اس تفرقہ نے ایک اور شکل اختیار کی۔ اور اب اس بارے میں بہت اختلاف ہے۔ کہ آیا ہندوستانی مسلمان حج کرنے کے لئے جائیں یا نہ جائیں۔ ایسے زمانے میں جبکہ ابن سعود کا اقتدار ہو۔ اور بعض یہ کوشش کر رہے ہیں۔ کہ اس سال لوگ حج کو نہ جائیں۔ میں اس سب جھگڑے کو مسلمانوں کی بدقسمتی خیال کرتا ہوں۔ میں اس بحث میں کسی فریق کی طرفداری نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ بلا تامل عرض کروں گا۔ کہ میری رائے میں کسی ایسے شخص پر جو حج کا ارادہ رکھتا ہو بیرونی طور پر دباؤ ڈالنا کہ وہ جائے یا نہ جائے افراد کی آزادی میں بے جا خلل اندازی ہے۔ مکہ شریف کا حج مثل دیگر فرائض اسلام کے ہر شخص کے ضمیر کے متعلق ہے۔ اور ہر مسلمان کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ اپنے حج کا انتظام اپنی ضمیر کے منشا کے مطابق اور اپنے حالات اور سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کرے تاوقتیکہ یہ نہ ثابت ہو کہ عرب میں کوئی حکومت ایسی ہے جو حج کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے یا حاجیوں کو مناسب سہولتیں نہیں دیتی۔ اسوقت تک

بیرون عرب کا کوئی شخص اس حکومت کو بُرا قرار دینے کا حق نہیں رکھتا۔ میری دانست میں مسلمانانِ ہندوستان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دیگر اسلامی ممالک سے متعلق جو ان کے حقوق ہیں۔ وہ محدود ہیں۔ اور ان کے لئے یہ مناسب نہیں۔ کہ وہ ایسی اقوام کو سیاسی معاملات میں ہدایت دینے کا کام اپنے سپرد کر لیں۔ جن سے ان کا رشتہ صرف ہم مذہبی پر مبنی ہے۔ انہیں یہ بھی جاننا چاہئے۔ کہ اسلامی حیثیت سے بھی ان کا اولین فرض یہ ہے۔ کہ وہ پہلے یہاں کے مسلمان بھائیوں کی خدمت کریں۔ اور کوئی ہندوستانی مسلمان جو اس فرض سے غفلت کرتا ہے۔ اس بناء پر کہ وہ بیرون ہند کے مسلمانوں سے زیادہ ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں نہ ہمدرد مسلمان اور نہ سچا ہندوستانی بن سکتا ہے۔ یہاں سب صاحبوں سے جو ان بیکار مباحثوں میں مشغول ہیں ادب سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ اپنی قوتوں کو ایسے کاموں میں صرف کریں۔ جن سے کچھ نفع ہو۔ اور جن سے کوئی معتدبہ نتیجہ نکل سکے۔

ہندوستان کی ترقی کے متعلق بے شمار کام ہمارے سامنے ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کی ترقی کا کام بھی ہے۔ اور وہ سب کام ادھورے پڑے ہیں۔ صرف اس لئے کہ سرگرم کارکن نہیں ملتے۔ اور ایسی حالت میں یہ قرین انصاف نہیں۔ کہ ہمارے کئی مستعد آدمی اپنا وقت اور روپیہ اور ضمناً قوم کا وقت اور روپیہ نزاع پیدا کرنے اور تفرقے بڑھانے میں صرف کریں۔

جو مسائل اس وقت ملک کو بہ حیثیت مجموعی درپیش ہیں۔ ان میں سے ایک بہت ہی مشکل اقتصادی مسئلہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان اور انگلستان کے زرمسکوک کے مبادلہ کی شرح مقرر کی جائے۔ آپ میں سے اکثر نے یقیناً وہ بحثیں ملاحظہ کی ہونگی۔ جو اخبارات میں اور تقریروں کے ذریعہ ہو رہی ہیں۔ جب سے کہ کرنسی کمیشن کی رپورٹ اور سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کا

اختلافی نوٹ شائع ہوا ہے - مجھے افسوس ہے - کہ میں اقتصادی مسئلوں کا ماہر نہیں ہوں - اور خاص کر ایک ایسے مسئلے میں جس پر ماہران فن اختلاف رکھتے ہیں - مجھے رائے زنی کی جرأت نہیں ہو سکتی - ملک میں طبقۂ تجارت کے نائیبین کی طرف سے کرنسی لینک قائم ہو رہی ہیں اس رائے کی تائید کے لئے جو غیر سرکاری حلقوں میں مقبول ہے اور ادھر سے سر باسل بلیکٹ صاحب جو حکومت ہند کے فنانس ممبر ہیں - اس رائے کی تائید کر رہے ہیں - جو کمیشن کی اکثریت نے قائم ہے - ہم میں جو لوگ اقتصادیات سے خاص واقفیت رکھتے ہیں اور جو دونوں تجویزوں کے حسن و قبح کا موازنہ کر سکتے ہیں - اُن کو چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی رائے قائم کر کے اس کے حل کرنے میں مدد دیں - ہمیں اس لیگ کے متعلق ایک شعبہ ایسا رکھنا چاہئے کہ جو اقتصادی مسائل پر خاص توجہ کرتا رہے - کیونکہ یہ مسئلے بسا اوقات سیاسی مسئلوں سے بالکل ملے ہوئے ہوتے ہیں - اور اس زمانے کی سیاسیات کا چلانا اقتصادی مسائل کو سمجھے بغیر مشکل ہے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اقتصادیات کی طرف وہ توجہ نہیں کی جو اس مضمون کا باعتبار اہمیت استحقاق ہے - اور انہیں اس مضمون کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کو سمجھنے کی خاص کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر اگر بعض سیاسی معاملات میں وہ کچھ بڑھینگے بھی تو انہیں اصلی فائدہ نہیں پہنچ سکتا "

اس مضمون سے ملتا ہوا ایک اور مسئلہ ہے - جس پر میں اپنی تقریر ختم کرنے سے مختصراً بحث کرنا چاہتا ہوں - اور وہ صنعتی یا حرفتی ترقی کا سوال ہے - یہ تو سب مانتے ہیں - کہ اس ترقی کی ضرورت ہے اور ہندوؤں مسلمانوں دونوں کو درکار ہے - بلکہ مسلمانوں کو دوسرے

سے کسی قدر زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ حال میں کسی قدر ترقی اس بارے
میں ہوئی ہے۔ مگر عموماً سرکاری تحریکوں کے ذریعہ سے کچھ نتیجہ پیدا
ہوا ہے۔ خود لوگوں نے یا سیاسی رہنماؤں نے اس میں کما حقہٗ
حصہ نہیں لیا۔ زراعت اس ملک میں سب سے عام پیشہ ہے۔ اور
بہت سے غریب زمیندار خاص کر میرے صوبے میں مسلمان ہیں۔ ایک
تحریک جس سے زراعت پیشہ لوگوں کو مدد مل سکتی ہے۔ وہ امداد باہمی
(کوآپریٹو) کی تحریک ہے۔ اور پنجاب میں اس تحریک کو خاص کامیابی
ہوئی ہے۔ زمینداروں کو اس سے اپنے کاروبار کے انتظام کرنے
کی خاص تربیت حاصل ہو رہی ہے۔ میں نے سنا ہے۔ اور صوبوں میں
بھی یہ تحریک اچھا کام کر رہی ہے۔ اور خاص کر بمبئی میں مگر ضرورت
یہ ہے۔ کہ یہ تحریک بہت عام ہو جائے۔ اور جہاں موجود ہے۔ وہاں
اس کا کام زیادہ شدومد سے جاری ہو۔ تاکہ جو فوائد اس سے حاصل
ہوسکتے ہیں پورے طور پر مترتب ہوں۔ میں یہ مشورہ پیش کرتا ہوں۔
کہ امداد باہمی کا طریق پرائیویٹ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے بھی زیادہ
پھیلے۔ اور زراعت پیشہ لوگوں کے سوا جو دستکار ہیں اور غریب لوگ
شہروں میں ہیں۔ ان میں بھی رواج پا جائے۔ ایک دستکاری جو
زمانہ دراز سے اس ملک میں لاکھوں آدمیوں کا ذریعہ معاش ہے
وہ کرگاہوں پر کپڑا بنتا ہے۔ اور اس جماعت میں مسلمانوں کی ایک
کثیر تعداد ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے۔ کہ اس صنعت کی امداد کی طرف
بہت کم مسلمانوں نے توجہ کی ہے۔ کانگریس نے مہاتما گاندھی جی کے
زیر اثر اس مطلب کے لئے کھدر کے استعمال پر بے شک زور دیا تھا۔
میری دیر سے یہ رائے ہے۔ کہ گاندھی جی نے جن چیزوں کی تاکید کی۔
اس میں کھدر کا استعمال ایک بہت مفید چیز تھی۔ مگر جس طرح اس

کا پرچار کیا گیا۔ وہ ایسا نہ تھا۔ کہ اس سے کوئی مستقل نتیجہ پیدا ہو۔
مہاتما گاندھی نے سودیشی مال کی تائید کے شوق میں جب یہ کہا۔
کہ اس ملک کے زمانے میں لوگ چرخہ کاتیں۔ اور اس کو اپنے سیاسی
مذہب کا ایک جزو سمجھیں۔ تو وہ میرے نزدیک مناسب حد سے
تجاوز کر گئے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہا۔ کہ عورتیں دوبارہ اپنی دادیوں
نانیوں کی تقلید کریں۔ اور چرخہ کاتیں۔ بلکہ اس پر اصرار کیا۔ کہ مرد بھی
روز کچھ وقت چرخہ کاتا کریں اور اس کو تہذیب نفس کا ذریعہ بنائیں
قدرتی طور پر اس کا ردعمل ہوا اور بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے
خود کانگریس میں اس مضمون کی تجاویز پاس کیں۔ اس پر عمل کرنے
سے گھبرانے لگے۔ اسطرح گو بہت سے بڑے بڑے کانگریسی اور خلافتی
لیڈروں نے خود کھدر پہن کر پبلک کے سامنے ایک قابل تقلید مثال
پیش کی۔ مگر آخر اس رسم کی ہردلعزیزی میں اس بات سے خلل آ گیا۔ کہ
کھدر پوشوں نے ترغیب کے ذریعہ سے لوگوں کو اس طرف مائل کرنے
کی بجائے اس کے رواج میں زبردستی سے کام لینا شروع کیا۔ اور اسے
بھی ایک قسم کا مذہب بنا دیا۔ ان دنوں میں ایک ایسا زمانہ تھا۔ کہ جب
کوئی شخص کھدر کی وردی کے بغیر سیاسی جلسے میں بار نہیں پا سکتا
تھا۔ اور کھدر کی ٹوپی یا قمیص کئی منافقوں نے پہننی شروع کر دی تھی
اور وہ اُسے "ستر عیب سفیدی پوشانے" والی ضرب المثل کا مصداق
سمجھتے تھے۔ اس سے کھدر کی تحریک میں تقویت ہونے کی بجائے
کمزوری پیدا ہو گئی۔ مگر اب وہ زمانہ آ گیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو اس بات
کے معتقد ہیں۔ کہ ترغیب کے ذریعہ سے کسی کو مجبور کرنے کی نسبت زیادہ
کام نکل سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھیں۔ اور دیسی ساخت کی چیزوں کی
مقبولیت کو معقول اور کاروباری طریقے سے عام کریں۔ یہ وہ کام

ہے۔ جو کانگریس اور لیگ بلکہ سب پبلک تحریکیں مل کر سکتی ہیں۔
صاحبان! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا ہے۔ اور آپ کا ممنون ہوں۔ کہ آپ نے میرے خیالات کو توجہ سے سنا۔ میں اب اور زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ اول تو کانگریس اور لیگ دونوں کو یہ چاہیئے۔ کہ اپنا اپنا اندرونی انتظام درست کریں۔ اور جو لوگ ان کے اثر سے باہر چلے گئے ہیں۔ پھر ملانے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد انہیں چاہیئے۔ کہ دونوں جمع ہو کر اس بات کے وسائل سوچیں۔ کہ جہاں ممکن ہو۔ وہاں مل کر کام کریں۔ اور جہاں خلاف لازم ہو۔ وہاں دوستانہ طور پر الگ الگ روش قبول کر لیں۔ اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد وہ دونوں مل کر اس کمیشن کے روبرو جائیں۔ جو اصلاحات کے متعلق آیندہ بیٹھے گی۔ اور متفقہ طور پر مکمل اصلاحات کا مطالبہ اس سے کریں۔ اس اثنائے میں اسی منزل مقصود کی طیاری کے طور پر یہ کام کرے۔ کہ علمی۔ اقتصادی اور صنعتی امور میں مشترکہ کام کی مشق کرے۔ اگر ہم یہ سب کر لیں۔ تو ہم دنیا کو یہ ثابت کر دیں گے۔ کہ ہم اپنے معاملات کا انتظام خود کر سکتے ہیں۔ اور اس منتہائے خیال تک پہنچنے کے قابل ہیں۔ جس کا اظہار مسٹر گوکھلے آنجہانی جو ہندوستان کے مدبروں میں بہت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ ان سادہ الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ کہ ہم ہندوستانی صرف اسی قدر چاہتے ہیں۔ کہ ہم اپنے ملک میں ویسے بن جائیں۔ جیسے اور قومیں اپنے ملکوں میں ہیں۔
آخر میں مجھے ایک افسوسناک فرض ادا کرنا ہے۔ یعنی اس حادثہ کا ذکر کرنا ہے۔ جس سے نہ صرف اسی شہر کی فضا اس وقت

مکدر ہو گئی ہے - بلکہ جس پر سارے ملک میں بہت ناراضگی کا
جذبہ پھیلا ہے - سوامی شردھانند پر جو سفیہانہ وار کر کے انہیں
قتل کیا گیا - وہ ایسا فعل ہے - کہ ہر صحیح عقل والا ہندوستانی
خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اس سے نفرت کریگا - میں آپ کیطرف
سے اور اپنی طرف سے اس نفرت کا اظہار کرتا ہوں - اس واقعہ
نے ہم میں سے ان لوگوں کے خیالات کو بھی افسردہ کر دیا ہے - کہ
جو ملک کی بنسبت بہتر امیدیں رکھتے ہیں - اور پہلا اثر جو طبیعت
پر پڑتا ہے - وہ مایوسی کا ہے - مگر اس ہولناک قتل پر اظہار
افسوس کرتے ہوئے میں اپنے تمام اہل وطن سے اور خاص کر
ہندو صاحبان سے یہ درخواست کرنے کی جرأت کرتا ہوں - کہ
وہ ضبط سے کام لیں - اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات
کے سوال پر جداگانہ غور کرینگے - اور اس پر ایک غلط کار فرد واحد
کے فعل کا اثر نہ پڑنے دیں گے - اس قسم کے مسلمان جیسا کہ وہ
شخص ہے - جو اس قتل کے متعلق گرفتار ہوا ہے - اپنے مذہب کو
بدنام کرتے ہیں - حالانکہ اسلام قتل کو بہت مذموم قرار دیتا ہے
کئی مسلمان ایسے ہیں - جن کو سوامی شردھانند سے مذہبی پرچار کے
طریق کے متعلق اختلاف تھا - مگر مجھے یقین ہے - کہ ان کو بھی
دوسروں کی طرح اس امر کا نہایت افسوس ہوگا - کہ ان ایک ہم مذہب
ایسا قاتلانہ حملہ کر کے سوامی جی کی زندگی کا خاتمہ کر دے - اگر
کوئی شخص اسلام کو نقصان پہنچاتا یا شدھی تحریک کی مدد کرنا
چاہتا - وہ اس سے زیادہ پر اثر طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا
جو اس شخص نے کیا ہے ؎

مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس
بیرون شیرانوالہ دروازہ
سرکلر روڈ
لاہور
باہتمام ایم عبدالحمید منیجر